رسائل و مسائل

"اسلامی حکومت یا فرقہ دارانہ حکومت" کی مزید وضاحت

سوال بہت دنوں سے ارادہ تھا کہ عریضہ ارسال خدمت کروں۔ چند ضروری امور کے بارے میں عرض کرنا چاہتا تھا۔ مگر فرصت نہ ملی کہ اطمینانِ خاطر کے ساتھ لکھ سکوں۔ ایک نئی بات کی وجہ سے اب فوراً خط لکھا۔ پرسوں تازہ پرچہ ترجمان القرآن کا موصول ہوا۔ میرا معمول یہ ہے کہ رسالہ وصول کرتے ہی پہلی نشست میں تقریباً سارا رسالہ ختم کر دیتا ہوں۔ اس دفعہ "رسائل و مسائل" میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر طبیعت متأثر ہوئی۔ اور دل کا شدید تقاضا ہوا کہ اس بارے میں آپ کی خدمت میں ضرور عریضہ لکھوں اور اپنے تأثرات کا اظہار کر دوں۔

میں حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد اور مسترشد ہوں۔ اس عام تعلق کے علاوہ بعض وجوہات کی بنا پر حضرتؒ سے خصوصی ربط و تعلق بھی ہے۔ اور موجودہ دَور کے تمام علماء و مشائخ میں سب سے بڑھ کر مجھے عقیدت حضرت کے ساتھ ہے۔ اور میں نے جو کمالات اور علمی اور عملی فضائل کا اِدراک اُن کو دیکھ کر اور آزما کر کیا ہے اب تک اور کہیں سے نہیں ہوا لیکن اس قدر شدید تعلق اور عقیدت و احترام کے جذبہ رکھنے کے باوجود جماعتِ اسلامی کے بارے میں حضرت شیخؒ کی جو رائے تھی چونکہ میرا ایمانی ضمیر اس پر مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے حضرت کی رائے قبول نہیں کی۔ اگرچہ اس سے اُن کی عقیدت میں بھی کوئی فرق اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شرعاً میرے لیے ضروری نہ تھا کہ اگرچہ مجھے شرحِ صدر نہ بھی ہوا ہو اور بات بالکل سمجھ میں نہ آتی ہو لیکن پھر بھی ضرور حضرت کی یہ رائے میں

مان لوں۔ اور جماعت اسلامی یا آپ کے بارے میں وہ رائے رکھوں جو خود حضرت رکھتے تھے۔ چونکہ جماعت اسلامی کے بارے میں میرا رویّہ اپنی پوری جماعت مسلکِ دیوبند کے خلاف رہا اس لیے بعض لوگوں نے اس کو اپنے اساتذہ سے بغاوت سمجھا اور اسی جرم میں آج تک میں بعض کے ہاں مغضوب و معتوب ہوں اور بعض کے ہاں ملوم و مخذول۔ کوئی احسان جتانا مقصود نہیں۔ محض اظہار واقعہ کے طور پر عرض کروں کہ محض اس "جرم" پر مجھے کافی دنیوی اور مادی خسارا بھی برداشت کرنا پڑا۔ اور بہت سے فوائد و منافع کے تمتع سے محروم رہا ہوں۔ اور مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ میں نے جو روش اب تک اختیار کی ہے۔ خالص اللہ تعالیٰ کی خاطر کی ہے اور میں اس کو ایمانی تقاضا سمجھتا ہوں۔

بہر حال یہ تو ایک تمہید تھی۔ مقصد یہ ہے کہ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں یہ کسی گروہی عصبیت کی بنا پر نہیں بلکہ میں خود دینی تقاضا اور خیر خواہی سمجھ کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔

کچھ عرصہ قبل بھی ترجمان القرآن میں حضرت مدنیؒ کی کتاب "نقشِ حیات" کی ایک عبارت کے بارے میں آپ سے کسی نے سوال کیا تھا اور آپ نے اُس کے جواب میں لکھا تھا اس میں کافی تلخی اور تیزی و تندی پائی جاتی تھی۔ اوّل تو اس سوال کا جواب آپ کو دینا نہیں چاہیے تھا۔ سائل سے آپ یہ کہہ سکتے تھے جیسا کہ ابتدائی جواب میں لکھا بھی گیا تھا کہ عبارت کا مطلب خود مولانا سے پوچھیے۔ اُن کی عبارت ہے وہ خود اس کی تشریح کر دیں۔ لیکن آپ نے اپنی طرف سے خواہ مخواہ بلاضرورت سخت کلمات لکھ دیئے۔ میں نے وہ جواب پڑھا تو مجھے بھی مناسب معلوم نہ ہوا مگر مجھے آپ سے بھی تعلق و عقیدت ہے اس لیے اس کی توجیہ و تاویل کی اور اپنے تاثر کو دبا دیا۔ لیکن انہی ایام میں مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے اہلِ علم جو جماعت کے ساتھ غیر رسمی طور سے وابستہ تھے اور بہت کام بھی کیا کرتے تھے اسی طرزِ جواب پر سخت ناراض ہو گئے۔ ان کی رائے آپ کے بارے میں بدلنے لگی اور انہوں نے جماعت کی حمایت سے ہاتھ اٹھا دیا۔ مجھ سے بھی انہوں نے گفتگو کی بلکہ

مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کروں کہ آپ یہ بالکل بلا ضرورت اس قدر دل آزاری کے کلمات کیوں شائع فرماتے ہیں۔ مگر میں نے اُس وقت سکوت اختیار کیا۔ تازہ پرچہ میں پھر اُسی بات کو ذرا اُس سے بھی زیادہ تیز الفاظ میں دُہرایا ہے۔ حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد پھر ایسی باتیں تازہ کرنا اور اس انداز کے ساتھ لکھنا تو اور بھی نامناسب ہے۔ عام طور سے لوگ ایسا کیا کرتے ہیں اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی صاحبان اور دوسرے لوگ میرے بارے میں یا جماعت کے بارے میں ایسا ہی طرز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو ایسے امور میں دوسروں کی تقلید تو نہیں کرنی چاہیے۔ میں واقعہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک داعئ حق ہونے کی حیثیت سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور یہ اندازِ تحریر آپ کی شان سے بہت ہی فروتر ہے۔ اگر اُس تحریر پر آپ کا نام نہ ہوتا تو میں تو اپنے ذوق کے مطابق یہ کبھی یقین نہ کرتا کہ آپ اس سطح پر آسکتے ہیں۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر کسی نے یہ سوال آپ کے پاس بھیجا تو آپ کو اس کا جواب دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اگر مستفسر کو یہ افسوس ہے کہ "نقشِ حیات کی تصریحات اور مولانا کے اس جواب میں کوئی مطابقت نہیں" تو اپنے اس افسوس کے ازالہ کے لیے آخر وہ آپ سے کیوں خط و کتابت کی ضرورت محسوس کرتا ہے؟ یا تو وہ حضرت کی حیات میں اُن سے خط و کتابت کرتے۔ یا اُن کی وفات کے بعد اُن کے کسی جانشین، تلمیذ خاص یا کسی اور متعلق سے پوچھ لیتے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ تو آپ کا کوئی تعلق نہیں تھا کہ ان کی متعارض عبارات کی تطبیق کی ذمہ داری آپ پر پڑتی ہے اور آپ خواہ مخواہ جواب دہ ہیں۔ میں تو آپ پر اس قسم کی کوئی بدگمانی نہیں کرتا۔ لیکن یہاں بعض لوگوں نے اِس رائے کا اظہار کیا۔ کہ یہ مستفسر بھی بالکل فرضی ہے تاکہ اس طریقہ سے اسی قسم کے جواب کی اشاعت کا موقع مہیا کر دیا جائے۔ مولانا مرحوم کی عبارات سے جو نتائج آپ نے اخذ کیے ہیں اور پھر اُن پر تنقید کی ہے میرے خیال میں آپ نے اُس میں بھی اپنے بلند مقام سے اُتر کر گفتگو کی ہے۔ عام علماء اگر آپ کی عبارات کے ساتھ یہی طریقہ برتتے ہیں تو جائز طور پر وجہ شکایت ہوتی ہے۔ اور

انصاف کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اُس پر احتجاج کیا جائے۔ اس لیے میں آپ سے بھی شکایت کو جائز اور احتجاج کو تقاضائے انصاف سمجھتا ہوں۔ یہ جواب شائع کر کے واقعہ یہ ہے کہ آپ نے دینی لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اقامتِ دین کی منزل قریب لانے میں بھی اس کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس سے سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے اشخاص کی دل آزاری ہوئی جو آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی جدوجہد کو ایک دینی جدوجہد سمجھ کر نظریہ یا عمل کے اعتبار سے آپ کے شریکِ کار ہیں۔ خواہ آپ اسے اندھی عقیدت و تقلید کہیں یا اور کچھ۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کی محبت و عقیدت تمام علماء اور دیندار طبقہ کے سویدائے قلب میں جاگزین ہے۔ ان کی کسی رائے یا فتوی کو ممکن ہے بعض حضرات کسی وجہ سے قبول نہ کریں لیکن ان کی شان میں اگر ایسے کلمات کہے اور لکھے جائیں جن سے تنقیص و توہین ہوتی ہو تو ان کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہے۔ پس اُن کی وفات کے بعد جن باتوں کو چھیڑنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں اور اُن کو چھیڑنے اور شائع کرنے سے دین کا ذرّہ برابر فائدہ نہ ہو رہا ہو تو خواہ مخواہ کے لیے ایک نیا میدانِ جنگ کیوں گرم کر دیا جائے۔ موجودہ نازک حالات آنے والے انتخابات کی اہمیت کو محسوس فرما کر آپ نے بھی الاہم فالاہم کے اصول پر اور حکمتِ عملی سے کام لے کر دوسرے بہت سے امور میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اور ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ تو کیا یہ حکمتِ عملی میں شامل نہیں ہو سکتا۔ کہ ان ایام میں علماء کرام کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ خواہ اُن میں سے بعض تجاوز بھی کر جائیں لیکن کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جائے۔ مَیں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ حضرات کا تمام چھوٹے بڑے الزامات کے مقابلہ میں سکوت اختیار کرنا اور مروا کراما پر عامل بن جانا، دین کے لحاظ سے زیادہ مفید ہے اور اسی میں جماعت کا وقار بھی ہے۔ بات بہت طویل ہو گئی، مقصد آپ مختصر اشارہ سے بھی سمجھ سکتے تھے۔ آپ ضرور اس بات پر غور فرما کر اس کا اب تدارک کریں اور اس کے مضر اثرات کو کسی احسن طریقہ سے زائل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے بارے میں جو کچھ علماء

اعتراضات کر رہے ہیں ہم کو تو شب و روز ان کی جواب دہی کرنی پڑتی ہے میں تو رسمی طور سے متعلق نہ ہونے کے باوجود لوگوں کے خیال میں "پکا مودودی" ہوں۔ میں ان اعتراضات کی مدافعت کرتا رہا ہوں۔ لیکن اس تازہ تحریر پر کوئی اعتراض کرے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اور پھر آپ کے بارے میں کچھ کہا جائے اُس کی برداشت بھی مشکل سے ہوتی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں اس کا اثر تحریک پر اور اس واسطہ سے اقامتِ دین کے فریضہ پر پڑ جاتا ہے۔ آپ کا بہت سا قیمتی وقت اس پریشان گوئی میں خرچ کر دیا۔ مگر خدا کرے اس کا نتیجہ کوئی اچھا نکلے۔"

جواب :- جواب میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ میں سرگودھا گیا ہوا تھا اور میری غیر موجودگی میں آپ کا خط پہنچا جواب واپس آنے کے بعد عرض کر رہا ہوں۔

مولانا مدنی مرحوم کے ساتھ آپ کے تعلق سے میں واقف ہوں، اور اس گہرے تعلق کے باوجود میرے اور جماعت اسلامی کے ساتھ آپ کا جو ربط ہے اسے میں آپ کی انصاف پسندی و حق پرستی کی کھلی دلیل سمجھتا ہوں جس کی اگر قدر نہ کی جائے تو ظلم ہو گا۔ لیکن رسائل و مسائل میں "نقشِ حیات" کی جن عبارتوں کے متعلق ایک صاحب سے میری جو مراسلت شائع ہوئی ہے، اس پر آپ کے اعتراضات میری سمجھ میں نہیں آئے۔ آپ خود بھی اگر مولانا کی عقیدت سے صرفِ نظر کر کے دوبارہ اس مسئلے پر غور کریں تو مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے ان اعتراضات میں کوئی معقولیت محسوس نہ فرمائیں گے۔

نقشِ حیات جلد دوم کی جو عبارات زیرِ بحث ہیں، سب سے پہلے آپ خود ان کو مولانا کی کتاب میں پورے سیاق و سباق کے ساتھ ملاحظہ فرمالیں۔ عبارات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) "حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اس تحریک کے سردار اور بانی ہیں ان کے خط میں جو کہ وزیر گوالیار کے نام مدد طلب کرنے کے لیے لکھا گیا تھا (جس کو ہم بجنسہٖ آگے ذکر کریں گے) صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد ہندوستان کو اس بدیسی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک کرنا ہے۔ اس کے بعد ہندو اور مسلم مل کر بادشاہت

کے لیے جس کو مناسب سمجھیں منتخب کریں۔" (صفحہ ۵)

[آگے صفحہ ۱۳-۱۴ پر مولانا نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورۂ بالا خط نقل فرمایا ہے مگر اس میں خط کشیدہ مضمون موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اس کے برعکس یہ لکھا گیا ہے کہ "ایں ضعفا را از رؤسا و کبار و علماء عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمتِ اسلام بجان و دل کنند و بر مسند مملکت متمکن شوند"]

(۲) "علاوہ ازیں کسی فرقے کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس فرقے کے لیے بھی حکومت کے عہدوں اور منصوبوں (؟ منصبوں) کے دروازے ایسے ہی کھلے رکھے جائیں جیسے کہ خود اپنے فرقہ کے لوگوں کے لیے، اور ملکی و انتظامی معاملات میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہ برتا جائے۔ قرآن کا حکم ہے ولا یجرمنکم شنآن قوم" الآیہ (صفحہ ۱۰)

(۳) "اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس میں اضمحلال آنا شروع ہوا اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے رہے تو اب علماء نے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش سے ان کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن امان، سکون و اطمینان، ظلم و جور کی بیخ کنی اور خلقِ خدا کی عام رفاہیت و بہبودی تھا۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جس کی بھی حکومت ہو انصاف کرے۔" (صفحہ ۱۱)

(۴) "شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کا جو اقتباس اوپر گزر چکا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہیں .... (۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لیے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور ان کے شعائرِ مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان

کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا۔ (صفحہ ۱۱)

[حضرت شاہ صاحب کا جو فتویٰ مولانا نے صفحہ ۶-۷ پر نقل کیا ہے وہ اس کے بالکل برعکس معنی دے رہا ہے۔ اس میں تو شاہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جہاں امام مسلمین کا حکم جاری نہ ہو بلکہ کفار کا حکم چل رہا ہو وہاں بعض احکام اسلام سے تعرض نہ ہونا لاحاصل ہے۔ محض جمعہ و عیدین یا اذان و ذبح بقر کی آزادی ایسی سرزمین کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی]

(۵) "بے شک سید صاحب جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادران وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ برادران وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔" (صفحہ ۱۵)

عبارت نمبر ۱ کے متعلق تو کوئی شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں کہ یہ مولانا کی اپنی ہے، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ یہ کسی اور کی عبارت نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۶ پر مولانا نے کسی البرہان نامی پرچے سے ایک اقتباس نقل فرمایا ہے جو کتابت کے معروف قاعدے کے بعد دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر متن کے قلم سے خفی تر قلم میں لکھا گیا ہے اور یہ اقتباس صفحہ ۷ کی ابتدائی تین سطروں پر ختم ہو گیا ہے۔ پھر صفحہ ۷ سے مسلسل صفحہ ۱۶ تک ساری عبارت متن کے انداز میں چلتی ہے جس کے اندر جگہ جگہ دوسری کتابوں کے اقتباسات معہ حوالہ نقل ہوئے ہیں۔ تحریر و کتابت کے جو معروف قواعد ہمارے ہاں رائج ہیں ان کے لحاظ سے جو شخص بھی ان صفحات کی عبارتوں کو پڑھے گا وہ لامحالہ انہیں متن ہی کی عبارات سمجھے گا لیکن صفحہ ۱۶ کا پہلا پیراگراف ختم ہوتے ہی یکایک ہمارے سامنے پھر (البرہان ۲ جلد ۱۲ صفحہ از ۴۷ تا ۷۸) کا حوالہ آجاتا ہے

اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ البرہان سے نقل کردہ عبارت کہاں سے شروع ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ حوالہ صرف عبارت نمبر ۵ سے متعلق ہو جسے کسی طویل تحریر سے خلاصے کے طور پر لیا گیا ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ عبارات نمبر ۲، ۳، ۴ بھی البرہان ہی سے منقول ہوں۔ اس البرہان کو ہم نہیں جانتے کہ یہ کون سا پرچہ ہے۔ دہلی کا جریدہ برہان تو اس سے مراد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا نام برہان ہے البرہان نہیں۔ اس لیے اصل کی طرف رجوع کر کے تحقیق کرنا مشکل ہے۔ تاہم اگر صفحہ ۶ سے ۱۶ تک کا پورا مضمون بھی (جس میں عبارات نمبر ۲، ۳، ۴، ۵ واقع ہوئی ہیں) البرہان کا مان لیا جائے تو اس سے پہلے اور اس کے بعد جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا اس پورے بیان کی توثیق فرما رہے ہیں، اسے استشہاداً نقل فرما رہے ہیں، اور انہوں نے اشارۃً و کنایۃً بھی اس کے کسی جز سے اختلاف نہیں فرمایا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص اپنے کسی بیان کی تائید میں کسی دوسرے کی عبارت نقل کرتا ہے اور اس کے کسی جز سے اختلاف کا اظہار کیے بغیر اس کی توثیق کر دیتا ہے تو اس سے لازماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کا ہم خیال ہے اور الفاظ میں نہیں تو معنی میں ضرور اس کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے۔

اب ذرا ان عبارتوں کو آپ خود دیکھیے۔ ان میں کوئی باریکی یا پیچیدگی نہیں ہے کہ ایک عام آدمی ان کا مطلب نہ سمجھ سکے، اور تاویل سے ان کے مختلف مفہومات نکل سکتے ہوں۔ صاف صاف زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ جس ملک میں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے آباد ہوں وہاں اسلامی حکومت قائم کرنا ایک نامناسب فعل ہے، کیونکہ یہ ایک "فرقہ وار گورنمنٹ" ہو گی، اور اگر مسلمان اس میں خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنائیں تو یہ خلافِ انصاف ہو گا۔ ایسے ملک میں صحیح طریق کار یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ حکومت بنے، اور یہی اعلائے کلمۃ اللہ کا بھی سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔

۲۔ کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہاں اسلام کے احکام جاری ہوں اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں بھی ہو تو ملک دارالاسلام ہو سکتا ہے اگر مسلمان بھی فی الجملہ اقتدار میں شریک رہیں اور ان کے مذہبی شعائر کا احترام کیا جاتا رہے۔

۳۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی اگر حکومت ہو تو یہ ضروری ہے کہ غیر مسلموں کے لیے تمام عہدوں اور منصبوں کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ یہ خود قرآن کی تعلیم ہے اور ایسا نہ کرنا خلافِ عدل ہے۔

۴۔ پچھلے دو ڈھائی سو برس میں ہمارے علماء و صلحاء نے برِعظیم ہند میں اصلاحِ احوال کی جتنی کوششیں کی ہیں ان میں سے کسی کا مقصود بھی یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا نہ تھا۔ وہ صرف اچھی حکومت چاہتے تھے، خواہ اس کے حاکم مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

۵۔ حضرت سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کی تحریک کا مقصود بھی اسلامی حکومت کا قیام نہ تھا۔ وہ صرف انگریزوں کو نکالنے کے لیے اُٹھے تھے اور اس کے بعد ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترک حکومت قائم کر لیں۔

اِن باتوں میں سے نمبر ۲ کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب مرحوم نے توجہ دلانے پر صرف اتنی توضیح فرمائی تھی کہ وہ ہندوستان کی موجودہ حکومت پر "دارالاسلام" کی اصطلاح کا اطلاق نہیں فرماتے، اور نمبر ۵ کے متعلق صرف یہ تشریح کی تھی کہ ان کے نزدیک حضرت سید احمد شہید کے پیش نظر سیکولر اسٹیٹ (لادینی ریاست) قائم کرنا نہ تھا۔ لیکن آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان توضیحات سے اُن اصولی باتوں میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو مذکورۂ بالا ۵ نکات میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر نکتہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے، اور ہر ایک اسلام اور مسلمانوں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ اس کا زہریلا اثر صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ پاکستان تک بھی پہنچتا ہے۔ یہاں بھی جو لوگ مولانا کے شاگرد، مرید، یا عقیدت مند ہیں، یا دین کے معاملہ میں ان کے علم پر اعتماد رکھتے ہیں، ان کی ایک کثیر تعداد مولانا کے ان خیالات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اور ان خیالات کا اثر جو بھی قبول کریگا اس کا نقطۂ نظر لازماً یہ بنے گا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا غلط اور ہندو مسلم مشترک حکومت قائم کرنا ہی صحیح ہے۔ اس کے ذہن میں دارالاسلام کی ایک سراسر غلط تعریف بیٹھ جائے گی، وہ ایک روادار لادینی حکومت کو بھی اطمینان کے ساتھ دارالاسلام سمجھ لیگا، اور اس کے بعد مشکل سے ایک خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوئی تڑپ اس کے دل میں باقی رہ جائیگی

وہ ماضی قریب کی تمام اسلامی تحریکوں کے متعلق بھی بالکل ایک غلط تصور لے کر بیٹھ جائے گا اور یہ باور کرلیگا کہ اس دور میں ہمارے تمام دینی پیشوا اسلامی حکومت قائم کرنے کے بجائے اصولاً اسی طرز کی مشترک ہندو مسلم حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جیسی ہندوستان کے کانگریسیوں نے قائم کی ہے اور پاکستان کے کانگریسی، عوامی لیگی، ری پبلکن اور نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ان سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر جس شخص کا بھی بن جائے گا وہ مشکل ہی سے اس الجھن میں مبتلا ہونے سے بچ سکے گا کہ اگر فی الحقیقت انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے مشترک وطن میں ایک "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم نہ کی جائے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے جو "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم کی تھی، جس کی مجلس شوریٰ میں ایک بھی غیر مسلم نہ تھا، جس میں کوئی جج، کوئی گورنر، کوئی عامل، کوئی سپہ سالار غیر مسلم نہ تھا، جس میں غیر مسلم ذمی بنائے گئے تھے اور ان پر جزیہ لگایا گیا تھا، جس میں خالص اسلامی آئین و قانون رائج تھا اور نظم حکومت کی پالیسی متعین کرنے میں بھی غیر مسلموں کا کوئی دخل نہ تھا، آخر اس کو کس دلیل سے انصاف قرار دیا جائے گا؟ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا راجح طریقہ قرار پائے گا یا مرجوح؟ وہ حکومت ہمارے لیے معیار قرار پائے گی یا مغل حکومت جسے مولانا "نقش حیات" میں بار بار نظیر کے طور پر پیش کرتے ہیں؟

یہ باتیں ہیں جن کے متعلق آپ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان پر گرفت نہ کروں اور ان کے معاملہ میں خاموشی اختیار کروں۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کسی وقت تنہائی میں خالصۃً لوجہ اللہ اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ کیا واقعی مجھ سے آپ کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے؟ اس میں دین اور اس کی مصلحت کی بہ نسبت اپنا استاذ اور اپنا گروہ تو آپ کے لیے عزیز تر نہیں ہو گیا ہے؟ اس کے لیے جو دلائل و وجوہ آپ نے بیان کیے ہیں، ان میں سے کسی کے اندر بھی خود آپ کوئی وزن محسوس کرتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ حضرت مدنی کی وفات کے بعد ایسی باتیں کرنا مناسب نہ تھا؟ لیکن یہ بات اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جبکہ حضرت موصوف کے ذاتی عیوب پر کوئی کلام کیا جائے۔ ایسی بات جو شخص بھی کرے اسے ملامت کرنے میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں گا لیکن دینی معاملات

یا اجتماعی مسائل میں کسی شخص کے خیالات پر بحث نہ کرنے کے لیے یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا انتقال تو بے شک ہو چکا ہے مگر اس کے خیالات تو شائع شدہ صورت میں موجود ہیں اور ہیں گے اور لوگوں کے ذہن پر اثر ڈالتے رہیں گے۔ ان پر اگر اس دلیل سے بحث کرنا غیر مناسب ہے کہ ان خیالات کا پیش کرنے والا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو یہ چیز مولانا حسین احمد صاحب ہی کے لیے خاص کیوں ہو۔ پھر تو کسی وفات یافتہ شخص کے کارنامے پر بھی بحث کرنا درست نہ ہو گا اور ہمیں تمام ہی پچھلے لوگوں کے غلط خیالات کو پھیلنے کی کھلی چھٹی دینی پڑے گی۔

آپ کہتے ہیں کہ مستفسر نے مولانا مرحوم کے ارشادات کے متعلق تم سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب تمہارے ذمہ تو نہ تھا۔ تمہیں اس کا جواب دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مولانا کے سوا کسی اور شخص کے گمراہ کن خیالات سے پریشان ہو کر کسی نے مجھ سے سوالات کیے ہوتے اور میں نے اس کے جواب میں ان خیالات کی تردید کر کے اسے اور دوسرے بندگانِ خدا کو ان سے بچانے کی کوشش کی ہوتی تو کیا اس وقت بھی آپ مجھ سے یہی بات کہتے جو اب کہہ رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب مجھے دینے کے بجائے آپ اپنے ضمیر ہی کو دے لیں اور خود ہی غور کریں کہ اِس خاص معاملے میں جو آپ عام حالات سے مختلف طرزِ عمل اختیار فرما رہے ہیں اس کا اصل محرک کونسا جذبہ ہے اور آیا وہ للہ وفی اللہ ایک محمود جذبہ ہے یا اس میں نادانستہ اسی تحزب اور اپنوں کی جانبداری کا وہ لوث شامل ہو گیا ہے جو خدا کے بے لاگ دین کی نظر میں کبھی محمود نہیں ہو سکتا۔

آپ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت مدنی کی محبت و عقیدت تمام علماء اور دیندار طبقہ کے سویدائے قلب میں جاگزیں ہے، اور ان کے خیالات پر تنقید کرنا ان لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے، اس لیے مجھے یہ کام نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے وہ لوگ میری اور جماعت کی تائید سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ میں اس کے جواب میں مختصراً صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ جو شخص میرے اور جماعت اسلامی کے اس کام کو میرا اور جماعت کا کوئی ذاتی "کاروبار" سمجھتا ہو اور اس میں بطورِ احسان ہاتھ بٹانے آ رہا ہو تو وہ سخت گناہ گار ہے۔ کیونکہ دین کے نام سے کاروبار کرنا اور اس کاروبار میں حصہ لینا وہ بدترین تجارت ہے جس سے زیادہ خسارے

کا سودا شاید ہی کوئی ہو۔ کسی نے اگر آج تک یہ سمجھتے ہوئے ہماری تائید کی ہے تو اب اسے توبہ کرنی چاہیے اور فوراً اس تائید سے دستکش ہو جانا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی ہمارے اس کام کو خالصۃً للہ دین کا کام سمجھ کر ہماری تائید کرنے آتا ہے تو اس کے اور ہمارے درمیان جو معاملہ بھی ہو گا خالص حق پرستی کی بنیاد پر ہو گا۔ نہ ہم اس سے کوئی مطالبہ حق کے خلاف کر سکتے ہیں اور نہ وہ ہم سے خلافِ حق کوئی مطالبہ کر سکتا ہے۔ کسی کے پاس اگر اس مطالبے کے لیے کوئی دلیل ہو کہ "دنیا میں اور جو بھی دینی تصورات اور اصولوں کے خلاف کوئی کام کرے اس کی تو خبر لے ڈالو مگر ہمارے حضرتوں میں سے کوئی یہ کام کرے تو اس پر دم نہ مارو" تو وہ براہِ کرم اپنی دلیل پیش کرے۔ ہم بھی غور کریں گے کہ قرآن، حدیث، یا سلف صالحین کے اسوے میں اس دلیل کا کوئی مقام ہے یا نہیں۔ اور اگر ایسی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں ہے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطالبہ ماننے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ اس طرح کی شرطیں لیکر جو لوگ خدا کا کام کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئیں وہ ہمارے لیے سببِ قوت نہیں بلکہ سراسر سببِ ضعف ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کبھی حق قائم نہیں کر سکتے۔ وہ سب بیک وقت ہماری تائید سے دستکش ہو جائیں تو ہم اللہ کا شکر کریں گے۔

آپ نے بار بار اس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ میں نے حضرت مدنی کی عبارتوں پر تنقید کرنے میں بڑا دل آزار اندازِ بیان اختیار کیا ہے اور بہت نیچی سطح پر اُتر گیا ہوں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایک دل آزاری تو وہ ہے جو ایسی صورت میں لازماً ہر عقیدت مند آدمی کی ہو جاتی ہے جبکہ اس کے کسی محبوب بزرگ کے خیالات کی تردید کی جائے۔ یہ چیز بجائے خود ہی تکلیف دہ ہے، اس لیے اس کا شکوہ آپ کریں تو میں اس کی کوئی تلافی نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس سے زائد کوئی چیز آپ کو میری تحریر میں نظر آئی ہو جس پر واقعی "دل آزاری" کے معروف معنی کا اطلاق ہو سکتا ہو تو اس کی نشان دہی فرمائیں۔ مجھے اس پر اظہارِ معذرت کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ ہو گا۔ اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اپنے بزرگوں کے معاملہ میں شاگردوں اور مریدوں کی زبان استعمال کرنا آپ حضرات کے لیے تو بلاشبہ درست ہے اور آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے، مگر دنیا بھر سے آپ یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ بھی آپ کے بزرگوں کے سامنے شاگردانہ اور مریدانہ عجز و نیازمندی اختیار کرے۔ آپ کے اپنے گروہ میں دوسرے گروہوں کے بڑوں سے اختلاف

کرتے ہوئے جو بہتر سے بہتر اسالیب بیان استعمال ہوتے ہیں انہی کو آپ معیار مان لیں اور اس کے لحاظ سے دیکھیں کہ میری ان دونوں تحریروں میں جن کا آپ نے شکوہ کیا ہے کیا چیز واقعی قابلِ شکایت ہے۔

آپ نے اشارۃً یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ میں نے مولانا مرحوم کی کتاب سے عبارات نقل کرنے اور ان سے نتائج نکالنے میں وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو بعض مولوی صاحبان نے میرے ساتھ اختیار کیا ہے۔ میں نے آپ کی اس تنبیہ کے بعد پھر ایک مرتبہ نقشِ حیات کو پڑھ کر یہ تحقیق کرنے کی پوری کوشش کی کہ کہیں واقعی مجھ سے ایسی کوئی زیادتی تو نہیں ہو گئی ہے، مگر خدا گواہ ہے کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ ملی۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا اگر آپ واضح طور پر نشان دہی فرمائیں کہ میں نے کہاں عبارات میں کوئی تحریف کی ہے، یا سابق و لاحق سے کاٹ کر ان میں کوئی نئے معنی داخل کیے ہیں، یا ان سے ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو خود ان عبارات سے نہیں نکلتے۔ ایسی جس زیادتی کی بھی آپ نشان دہی فرمائیں گے مجھے اس پر اعترافِ قصور اور اظہارِ ندامت میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ میں نے ان عبارات پر گرفت کرنے میں انتقامی جذبہ سے کام لیا ہے۔ یہ بدگمانی آپ کرنا چاہیں تو کریں، مگر میں عنداللہ دوسروں کے گمانوں کے لیے نہیں بلکہ اپنی نیت ہی کے لیے جواب دہ ہوں۔ میرے نزدیک دین کا نام لے کر ذاتی محبت و نفرت یا نفسانی جذبات و اغراض کے لیے کوئی بات یا کام کرنا بدترین فریب کاری ہے اور میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے زیرِ قیادت دیوبند کے ایک خاص اسکول کی سیاست کو میں برسوں سے دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ غلط سمجھا اور کہا ہے۔ اس سیاست کی تائید میں اسلام اور اسلامی تاریخ کی جو عجیب تعبیریں یہ اسکول کرتا رہا ہے وہ میرے نزدیک نہایت غلط اور دین و اہلِ دین کے لیے سخت مضر ہیں۔ اور میری قطعی رائے، خوب سوچی سمجھی رائے، بالکل بے لاگ رائے یہ ہے کہ انگریزی دور کی آمد پر سرسید اسکول جس مقام پر کھڑا ہوا تھا، بدقسمتی سے ہندو دور کی آمد پر اسی مقام پہ دیوبند کا حسین احمد اسکول آ کھڑا ہوا، بلکہ مزید افسوس یہ ہے کہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس رائے کی بنیاد محض نقشِ حیات کی چند عبارات نہیں ہیں بلکہ اس اسکول کا وہ پورا

کارنامہ ہے جو پچھلے پندرہ بیس سال کی مدت میں اس سے ظہور میں آیا ہے۔

آپ نے مولانا کے بعض عقیدتمندوں کی اس رائے کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ "یہ مستفسر بھی بالکل فرضی ہے تاکہ اس طریقہ سے اسی قسم کے جواب کی اشاعت کا موقع مہیا کر دیا جائے۔" دوسرے الفاظ میں ان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ دراصل مجھے کسی شخص نے ان عبارات کے متعلق کوئی خط نہیں لکھا تھا بلکہ میں خود مولانا حسین احمد مرحوم پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے یہیں ایک خط و کتابت گھڑ لی گئی۔ واقعہ کے اعتبار سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل خط و کتابت دفتر میں محفوظ ہے اور وہ صاحب بھی ہندوستان میں زندہ موجود ہیں جن کے خطوط کے جوابات میں نے دیئے ہیں۔ آپ حضرات جب چاہیں وہ خط و کتابت بھی دیکھ سکتے ہیں اور خود اصل کاتب سے بھی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ رہی اس گمان کی اخلاقی حیثیت، تو جنہوں نے بے تکلف یہ افسانہ تصنیف کر ڈالا وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ یہ کیسا تزکیۂ نفس و اخلاق ہے جو مولانا مرحوم کے فیضِ صحبت سے ان کو میسر آیا ہے۔ اپنے گروہ کے لوگوں کے معاملے میں تو ان کے احساسات اتنے نازک ہیں کہ ان کی صریح غلطیوں پر بھی کوئی تنقید وہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مگر دوسروں کے دین و اخلاق پر ہر حملہ ان کے نزدیک بالکل مباح ہے حتیٰ کہ اپنے دل سے ایک خیالی الزام بھی تصنیف کر کے وہ ان کے سر تھوپ سکتے ہیں۔ اس پر میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ خدا ان حضرات کو وہ حقیقی تقویٰ عطا فرمائے جس کی بنا پر آدمی زبان سے ایک بات نکالنے سے پہلے سوچ لیتا ہے کہ وہ خدا کو اس کا کیا جواب دیگا۔